Al Islam Message

الاسلام مشن کا ترجمان

زیرِ نگرانی

مولانا ارشد جمال

■ ■ ■ ■ ■

Al Islam message

Urdu quarterly literature

D.43/107-Bazar Sadanand.

Varanasi, U.P. (India) 221001

Mob: +91-9307324317

E-mail:

info@alislammission.com

January to March 2012

<<<<<<>>>>>>

خدا کے ساتھ زندگی

انسان بظاہر تنہا ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ تنہا نہیں۔ وہ بہت سی خواہشوں اور ضرورتوں کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ کچھ چیزیں تو اُس کی زندگی میں اِس طرح شامل ہیں کہ اُن کے بغیر وہ زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔ جیسے: آب و ہوا اور غذا وغیرہ۔ اور کچھ چیزیں وہ ہیں جن کے بغیر وہ زندہ تو رہ سکتا ہے لیکن اُس نے اُن چیزوں کو اپنی زندگی کے لئے اتنا اہم اور ضروری بنالیا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اُن کے بغیر وہ مرجائے گا۔ جیسے: روپیہ پیسہ، کپڑا، مکان اور عورت وغیرہ۔ اِس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں اور ضرورتیں ہیں جو اُس کی زندگی میں شامل رہتی ہیں اور وہ اُن کے بغیر جینے میں لطف نہیں پاتا۔ ایسے ہی ایک انسان، کچھ دوسرے انسانوں کے ساتھ زندگی گزارتا ہے، خواہ وہ اُس کے عزیز رشتے دار ہوں یا دوست احباب۔ لیکن یہاں انسانوں نے ایک بہت بڑا ستم برپا کر رکھا ہے، وہ ہزاروں خواہشوں اور ضرورتوں کے ساتھ تو زندگی گزار رہے ہیں، لیکن جسے اپنی ضرورتوں کی فہرست میں سب سے اوپر رکھنا چاہئے تھا، جس کی خواہش تمام خواہشوں سے بڑھ کر کرنی چاہئے تھی، اُسی کو انسان بھلا بیٹھے ہیں۔ وہ کون ہے؟ وہ انسانوں کا خدا ہے۔ انسان، خدا کے بغیر کیسے زندگی گزارتا ہے! انسانوں کی تمام خواہشوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے والا خدا ہے، لیکن اُنھوں نے خدا کو چھوڑ دیا اور خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے اپنی زندگی کو بھر لیا۔ اب وہ اُنہی نعمتوں اور نوازشوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کافر تو کافر ہیں، جو ایمان کا کلمہ پڑھ کر ایک خدا کے وجود کو تسلیم کر چکے ہیں اور اُسے قدرتوں اور نعمتوں والا جان چکے ہیں۔ اُن کی بے حسی کا حال یہ ہے کہ اُنھوں نے خدا کو اپنے گھر میں داخل ہی ہونے نہیں دیا۔ اُن کے گھروں میں اُن کا دل بہلانے کے لئے کتے کے پلّے تو موجود ہیں، اُن کی لذتوں کو بڑھانے کے لئے عریاں اور فحش مناظر تو چل پھر رہے ہیں، اگر کچھ نہیں ہے تو وہ خدا کی یاد، خدا کی بات اور خدا کا تصور ہے۔ اُنھیں سب کے ساتھ تو زندگی گزارنا گوارا ہے، خدا ہی سے اتنی ناگواری اور دوری ہے کہ وہ خدا کے بغیر پوری زندگی گزار دیتے ہیں اور اُن کی زندگی پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

کم اور زیادہ شکر

شکر، نعمت کا علم حاصل کرنے کا نام نہیں ہے۔ شکر نعمت کا اعتراف کرنے کا نام ہے۔ اعتراف، انسان کے اندر موجود ایک کیفیت ہوتی ہے۔ اعتراف جتنا زیادہ ہوگا، کیفیت اُتنی زیادہ ہوگی۔ کم اعتراف سے کم کیفیت پیدا ہوگی اور زیادہ اعتراف سے زیادہ کیفیت پیدا ہوگی۔ شکر علمی چیز نہیں ہے۔ شکر روحانی چیز ہے۔ شکر اگر شعوری چیز ہوتی تو دنیا میں کوئی ناشکرا نہیں ہوتا۔ ہر آدمی کو خدا کی نعمتوں کا شعور ہے، لیکن ہر آدمی شکر گزار بندہ نہیں۔ اِسی لئے قرآن میں ہے: ''وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ''۔ (یعنی میرے شکر گزار بندے کم ہیں۔) شکر گزار بندوں کی کمی اِس لئے نہیں کہ نعمت کا شعور کم لوگوں کو ہے، بلکہ یہ کمی اِس لئے ہے کہ نعمت کا اعتراف کم لوگوں کو ہے۔

کچھ لوگ یہ سمجھتے کہ جس کو نعمت کا جتنا زیادہ علم ہوگا، اُس کے اعتراف کی کیفیت بھی اُتنی زیادہ ہوگی، لھذا جس کو نعمت کا جتنا زیادہ علم ہوگا، وہ اللہ کا اُتنا زیادہ شکر گزار بندہ ہوگا، لیکن یہ بنیادی طور پر ایک بڑی غلط فہمی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس کے پاس کسی نعمت کا تفصیلی علم ہو تو اُس کے اندر اعتراف کی کیفیت بھی بڑھ جائے اور وہ اپنے تفصیلی علم کی بنیاد پر زیادہ بڑا شکر گزار بندہ بن جائے۔ اِس کی مثال اِس دور میں سائنسداں ہیں۔ مثلاً آسمان سے پانی کیسے برستا ہے؟ اِس کا پورا ایک پراسس (process) ہے جس کو آج کے سائنسدانوں نے دریافت کیا ہے۔ یہ دریافت پہلے نہ ہوسکی تھی تو کیا آج کا سائنسداں جب ایک گلاس پانی پیے گا تو اپنے زیادہ علم کی وجہ سے وہ اللہ کا زیادہ شکر گزار بندہ ہوگا اور سائنسی دریافت سے پہلے جو صحابہ اور تابعین گزرے ہیں، وہ زندگی بھر پانی پی کر اللہ کا زیادہ شکر ادا کرنے والے نہ بن سکے، کیونکہ اُنھیں پانی کے سائنسی پراسس (scientific process) کا علم نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک کھلی ہوئی غلطی ہے۔ شکر کے قلیل اور کثیر ہونے کا فیصلہ نعمت کا علم، قلیل وکثیر ہونے پر نہیں ہے، بلکہ اعتراف کی کیفیت کے قلیل وکثیر ہونے پر ہے۔ ایک اَن پڑھ آدمی جسے نہیں پتہ کہ پانی کی حقیقت کیا ہے؟ اگر دو گھونٹ پانی پی کر اعترافِ نعمت کی کیفیت سے سرشار ہوجائے تو وہ زیادہ شکر گزار بندہ ہے اور ایک سائنسداں جسے پانی کے پورے پراسس کا علم ہو، لیکن اُس کے اندر اعتراف کی کوئی کیفیت ہی پیدا نہ ہو تو وہ اپنے زیادہ علم اور زیادہ دریافت کے باوجود ناشکرا ہے۔ خدا کی تمام نعمتوں کو اِسی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ ضروری چیز نعمتوں کا علم نہیں ہے، بلکہ ضروری اور اہم چیز اُن نعمتوں کا اعتراف ہے۔

پیغمبر کا صحیح تعارف

سورۃ آل عمران کی آیت نمبر:159 ہے:

''فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنۡتَ لَهُمۡ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوا مِنۡ حَوۡلِكَ''.

(یعنی یہ اللہ کی رحمت ہی ہے کہ تم اُن کے لئے نرم دل ہو اور اگر تم بد اخلاق ،سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کو چھوڑ کر چلے جاتے۔)

اِس آیت میں اللہ کے رسول ﷺ کی ایک خوبی یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ سخت دل نہیں ہیں،لیکن قرآن کی ایک اور آیت ہے جو سورۃ التوبۃ (73)اور سورۃ التحریم (9) میں دوبار آئی ہے۔وہ آیت یہ ہے:

''يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الۡكُفَّارَ وَالۡمُنَافِقِينَ وَاغۡلُظۡ عَلَيۡهِمۡ''.

(یعنی اے نبی! کافروں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کرو اور اُن پر سخت دل ہو جاؤ)

اِس آیت میں نبی کو سخت دل بتایا گیا ہے۔اگر دونوں آیتوں کو دیکھا جائے تو ایک میں نبی کے سخت دل ہونے کا انکار کیا گیا ہے اور دوسرے میں نبی کو سخت دل بتایا گیا ہے۔ظاہر کے اعتبار سے دونوں آیتوں میں تضاد ہے۔امام رازی نے اِس تضاد کو دور کرنے کے لئے لکھا ہے کہ: آپ کو مومنوں کے لئے سخت دل ہونے سے منع کیا گیا ہے اور کافروں کے لئے سخت دل بننے کا حکم دیا گیا ہے۔ (تفسیر الرازی:66/9) عام طور پر مفسرین نے یہی لکھا ہے کہ سورۃ آل عمران کی آیت کا تعلق مومنوں سے ہے اور اُس میں یہ بتایا گیا ہے کہ آپ مومنوں کے لئے سخت دل نہیں ہیں۔

آیتوں کی اِس تفسیر سے یہ ذہن بنتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ صرف مومنوں کے لئے مہربان اور رحم دل ہیں اور کافروں کے لئے رحم دل نہیں ہیں، بلکہ کافروں کے لئے سخت دل ہیں۔قرآن کی اِس تفسیر سے پیغمبرِ اسلام کا غلط تعارف ہوتا ہے۔پیغمبرِ اسلام فطری طور پر نرم دل،مہربان اور رحمدل ہیں،وہ فطری طور پر نہ بداخلاق ہیں،نہ بدکلام ہیں اور نہ سخت دل ہیں۔وہ مومنوں کے لئے بھی رحم دل ہیں اور کافروں کے لئے بھی رحم دل ہیں۔دونوں گروہ میں سے کسی کے لئے سخت دل نہیں۔سورۃ آل

عمران میں اِسی حقیقت کا بیان ہے۔جیسا کہ ”وَمَا أَرْسَلْنَاکَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ“ (الانبیاء:107) میں آپ کے اِسی حقیقی تعارف کو پیش کیا گیا ہے۔یعنی اے نبی! ہم نے تمھیں ساری کائنات کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔

سورۃ التوبۃ یا سورۃ التحریم میں آپ کی فطرت کا یا آپ کے حقیقی رویّہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہاں آپ کو وقتی طور پر ایک خاص موقع کے لئے کافروں اور منافقوں کے خلاف ایکشن لینے کا حکم ہو رہا ہے اور وہ وقتی اور عارضی موقع، جہاد کا موقع ہے۔پیغمبر کو کافروں اور منافقوں کے خلاف سختی کرنے کا حکم دیا ہی اِسی لئے گیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پیغمبر جو فطری طور پر بہت زیادہ نرم دل اور مہربان ہے، جہاد کے موقع پر بھی نرم رویّہ اختیار کرنے لگے اور اُن کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرنے لگے۔دشمن کی فوج پر بے رحمی سے ہتھیار چلانے والے کمانڈر کو بے رحم اور سخت دل سمجھ لینا نادانی ہے۔یا پبلک سے محبت کرنے والے پولیس افسر سے یہ اُمید رکھنا کہ وہ مجرموں کے ساتھ بھی محبت کا برتاؤ کرے گا اور اُن کے خلاف کوئی ایکشن نہ لے گا، ناتجربہ کاری کی بات ہے۔

مومنوں کے حق میں بھی آپ کو سخت دل ہونے یا ترس نہ کھانے کا حکم ہوا ہے، جیسا کہ سورۃ النور کی آیت نمبر: میں ہے:

”وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ“. (سورۃ النور:2)

(یعنی دین کے معاملے میں زانی اور زانیہ پر تمھیں ترس نہ آئے۔)

جس طرح اِس آیت میں ایک خاص موقع پر مومنوں کے لئے سخت دل ہو جانے کا حکم ہوا ہے، ٹھیک اُسی طرح کافروں کے لئے بھی ایک خاص موقع پر سخت دل ہونے کا حکم ہے۔جس طرح یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ آپ مومنوں کے لئے سخت دل ہیں (کیونکہ مومنوں کے لئے آپ کے رحمدل ہونے کے ثبوت میں دوسری آیتیں موجود ہیں۔) اُسی طرح یہ نتیجہ نکالنا بھی غلط ہے کہ آپ کافروں اور منافقوں کے لئے سخت دل ہیں، کیونکہ کافروں کے لئے آپ کے رحمدل ہونے کے ثبوت میں بھی آیتیں موجود ہیں۔

اشاعتِ اسلام

اسلام کی اشاعت کیسے ہوئی؟ اِس سوال کا جواب دینے میں جس طرح غیر مسلم غلطی کر رہے ہیں، اُسی طرح بہت سے مسلمان بھی غلطی کر رہے ہیں۔ جس طرح غیر مسلم یہ کہتا ہے کہ اسلام کی اشاعت تلوار سے ہوئی ہے، اُسی طرح مسلمان بھی یہ کہتا ہے کہ اسلام کی اشاعت تلوار سے ہوئی ہے۔ غیر مسلم تو اِس لئے غلطی کر رہا ہے کہ اُس کے سامنے اسلامی تاریخ کی وہ شکل پیش کی گئی ہے جس میں جنگ اور جہاد کو بہت زیادہ نمایاں کر کے بیان کیا گیا ہے اور مسلمان یہ سمجھ رہا ہے کہ جہاد کے ذریعے اسلامی حکومتوں کا دائرہ وسیع ہوتا رہا اور اُسی کے ساتھ اسلام بھی تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ یہاں دو چیزیں تھی، اُن دونوں میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ ایک ہے دینِ اسلام کی اشاعت، دوسرے اسلامی حکومتوں کی توسیع۔ جہاد کے ذریعے یہ کام ہوا کہ جو شرک اور گمراہی پھیلانے والی حکومتیں تھی، اُن حکومتوں کو تلوار کی طاقت سے ختم کیا گیا۔ یا تو اُن حکومتوں کا تختہ پلٹ گیا یا اُنھوں نے اسلامی حکومت کو ٹیکس ادا کرنے کی شرط مان کر اپنی حکومتوں کو بچا لیا، تو جہاں جہاں حکومتیں ختم ہوتی گئیں، وہاں وہاں اُن حکومتوں کی ذمہ داریاں اسلامی حکومت نے سنبھال لی۔ وہاں کی غیر مسلم پبلک کو کبھی اِس بات پر مجبور نہیں کیا گیا کہ وہ اسلام قبول کریں یا ٹیکس ادا کریں یا ملک خالی کر دیں۔ کتنے غیر مسلم، اسلامی حکومت میں رہ کر چین کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اِس صورتِ حال کو دیکھ کر عام طور پر لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے۔ اسلامی حکومت کی توسیع کو اُنھوں نے اشاعتِ اسلام کا ہم معنی سمجھ لیا۔ ساتویں، آٹھویں ہجری میں بہت سے خطیب منبر پر خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوتے تو وہ اپنے ہاتھوں میں تلوار لے کر کھڑے ہوتے۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے۔ علامہ ابن قیم جوزیہ (وفات: 1365ء) نے اپنی مشہور سیرت کی کتاب "زادُالمَعاد" (318/1) میں اِس نظریہ کی مذمت کرتے ہوئے لکھا ہے: "یہ دو وجہوں سے بری جہالت ہے۔ ایک تو یہ کہ نبی ﷺ عصا یا کمان کا سہارا لے کر خطبہ دیتے تھے۔ دین تو وحی کے ذریعے قائم ہوا ہے۔ تلوار تو گمراہوں اور مشرکوں کا زور توڑنے کے لئے تھی۔ مدینہ جہاں سے نبی ﷺ نے خطبہ دینا شروع کیا وہ قرآن کے ذریعہ فتح ہوا تھا نہ کہ تلوار کے ذریعہ"۔

متلاشی انسان

جنوبی شہر بنارس میں ویب ڈیزائننگ کی ایک چھوٹی سی کمپنی ہے، مجھے اپنی ویب سائٹ کی ڈیزائننگ کرانے وہاں جانا تھا۔ میں پہلی بار جا رہا تھا، مجھے صرف کمپنی کا ایڈریس اور اُس کے آفس کی گلی معلوم تھی۔ میں جب اُس گلی میں داخل ہوکر آگے بڑھنے لگا تو میں نہیں سمجھ سکا کہ اب مجھے کدھر جانا ہے؟ سیدھے چلتے رہنا ہے یا کسی گلی میں مڑنا ہے؟ چلنا ہے تو کتنا اور چلنا ہے؟ کون سی بلڈنگ میں اُس کا آفس ہے؟ میں یہی سب کچھ سوچتے ہوئے اور بلڈنگوں کو دیکھتے ہوئے کبھی چلتا تھا اور کبھی رُک جاتا تھا۔ میں ایک متلاشی انسان تھا، مجھے بہرحال کسی طرح آفس ڈھونڈ نکالنا تھا۔ میں نے ایک دُکاندار سے اُس کمپنی کا پتہ دریافت کیا تو اُس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کچھ سوچا پھر نفی میں سَر ہلا کر کہا کہ مجھے نہیں معلوم۔ بڑی مشکل تھی، اب کیا کروں؟ کچھ سوچ کر میں ایک بار پھر آگے بڑھا۔ کچھ ہی دور چلا تھا کہ مجھے اپنی مطلوبہ کمپنی کا بورڈ نظر آ گیا۔ مجھے جس آفس کی تلاش تھی، میں نے اُسے پالیا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ میں پہلی بار اِس گلی میں آیا اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے آفس کو پالیا، لیکن وہ آدمی جس سے میں نے آفس کا پتہ دریافت کیا تھا، وہ تو ایک زمانے سے اُسی گلی میں دُکان کر رہا تھا، اُسے کیوں نہیں اُس آفس کا پتہ معلوم ہو سکا، جبکہ اُس کی دکان آفس کے بہت قریب تھی۔ غور کرنے پر سمجھ میں آیا کہ یہ آفس کے قریب یا دور رہنے کا معاملہ نہیں۔ یہ معاملہ آفس کی ضرورت ہونے اور نا ہونے کا معاملہ ہے۔ یہ آفس کو تلاش کرنے اور تلاش نہ کرنے کا معاملہ ہے۔ اُس دکاندار کو آفس کی کوئی تلاش نہ تھی، وہ اِتنا قریب رہ کر بھی آفس سے بہت دور تھا اور مجھے آفس کی تلاش تھی تو میں بہت دور رہ کر بھی آفس کو پانے والا آدمی بن گیا۔

میں نے سوچا کہ خدا کے تعلق سے بھی لوگوں کا یہی معاملہ ہے۔ خدا تو انسان کے بے حد قریب ہے۔ ''وہ گلے کی رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں''۔ (ق:16) لیکن ہم دیکھتے ہیں لاکھوں اور کروروں لوگ بغیر خدا کے زندگی گزار رہے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو خدا کو جانتے اور مانتے ہیں، لیکن وہ خدا سے کوسوں دور ہیں۔ خدا جتنا زیادہ قریب ہے، انسان اتنا ہی زیادہ اُس سے دور ہے۔ یہ معاملہ خدا کے قریب ہونے یا نہ ہونے کا معاملہ نہیں۔ یہ خدا کو تلاش کرنے اور نہ کرنے کا معاملہ ہے۔ جس کو خدا کی تلاش ہوتی ہے، وہ خدا کو پالیتا ہے اور جس کو تلاش نہیں ہوتی، وہ خدا کے شہ رگ سے قریب تر ہونے کے باوجود، خدا کا منکر رہتا ہے۔

ناقص مطالعہ

دہلی کے ایک معروف اسلامی مفکر ہیں، جو بہت بڑے نقاد ہیں اور تنقیدی مطالعہ اُن کا محبوب مشغلہ ہے۔ اُنھوں نے اپنی ایک کتاب میں امام بخاری علیہ الرحمۃ (وفات: 870ء) پر اِس رُخ سے تنقید کی ہے کہ اُنھوں نے حدیثوں کو جن ابواب کے تحت درج کیا ہے، اگر اُن حدیثوں کو اُنھی ابواب تک محدود کردیں تو مزید کوئی تعلیم اُن حدیثوں میں دریافت نہ ہوسکے گی۔ اِس کے لئے اُنھوں نے چند مثالیں پیش کی ہیں، اُن میں سے ایک مثال پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''صحیح البخاری میں ہے کہ کعبہ کی بدلی ہوئی تعمیر کے سلسلے میں جب حضرت عائشہ نے کہا: اے خدا کے رسول، آپ کعبہ کو دوبارہ ابراہیمی اساس پر بنادیتے۔ رسول اللہ نے جواب دیا کہ تمہاری قوم (قریش) ابھی جلد ہی کفر کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوئی ہے۔ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ اُس سے بھڑک نہ جائے۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو میں ضرور ایسا کرتا (فتح الباری: ۵۱۳/۳) امام البخاری نے یہ حدیث کتاب الحج (باب فضل مکۃ وبنیانھا) میں درج کی ہے۔ اب اگر بعد کے لوگ امام البخاری کے قائم کردہ اس ترجمۂ باب پر اکتفا کرلیں تو وہ اس حدیث سے صرف فضائل مکہ جیسے مسائل اخذ کریں گے، اِس کے علاوہ اور کوئی تعلیم وہ اس حدیث میں دریافت نہ کرسکیں گے۔ حالانکہ اِس حدیث میں اسلام کی ایک نہایت اہم تعلیم بیان کی گئی ہے۔ اُس تعلیم کو ایک لفظ میں حکمتِ حیات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے''۔

یہ ناقص مطالعہ کی ایک کھلی ہوئی مثال ہے، کیوں کہ امام بخاری نے اِس حدیث کو صرف ''باب فضل مکۃ وبنیانھا'' کے تحت درج نہیں کیا ہے، بلکہ امام بخاری نے اِس حدیث کو چار بابوں میں درج کیا ہے۔ سب سے پہلے ''کتابُ العلم'' کے ''بَابُ مَنْ تَرَکَ بَعْضَ الاِخْتِیَارِ مَخَافَۃَ أَنْ یَقْصُرَ فَھْمُ بَعْضِ النَّاسِ عَنْہُ فَیَقَعُوا فِی أَشَدَّ مِنْہُ'' کے تحت درج کیا ہے۔ ہمارے نقاد نے اِس حدیث میں جس 'حکمت حیات' کو تلاش کیا ہے، اُسے خود امام بخاری نے پہلے ہی واضح لفظوں میں بیان کردیا ہے اور اُس کے لئے مستقل ایک باب قائم کیا ہے۔ اُنھوں نے جو باب قائم کیا ہے، اُس کا مطلب یہ ہے:

''اُس آدمی کا بیان جو اختیار رکھنے کے باوجود اپنا اختیار استعمال نہ کرے، اِس ڈر سے کہ کچھ لوگ اُسے سمجھ نہ

سکیں گے تو اُس سے زیادہ کسی دشوار چیز میں پڑ جائیں گے"۔

امام بخاری نے مذکورہ حدیث کا یہ جو مفہوم دریافت کیا ہے، غالباً وہ اُس میں سب سے آگے ہیں اور وہ مفہوم اب تک کی ہر دریافت سے زیادہ بہتر اور جامع ہے۔

پھر امام بخاری نے اُسی حدیث کو "کتاب احادیث الانبیاء" میں ایک باب کے تحت درج کیا ہے۔

پھر "کتاب التمنی" میں "بَابُ مَا یَجُوزُ مِنَ اللَّوْ" کے تحت درج کیا ہے۔

اِس ناقص مطالعہ کی تین وجہیں ہوسکتی ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اصل کتاب نہ دیکھ کر اُس کی شرح فتح الباری کا مطالعہ کیا گیا۔ اِس طرح کسی چیز کی تحقیق نہیں ہوتی۔ ہمیشہ مواد کو اُس کے اصل ماخذ سے لینا چاہئے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امام بخاری کے اُس طریقہ کو نظر انداز کر دیا گیا جو اُن کی کتاب کی ایک پہچان ہے، یعنی ایک ہی حدیث کو چند مختلف ابواب کے تحت درج کرنا۔ بخاری میں کسی حدیث کو ایک باب کے تحت دیکھ کر یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ کسی دوسرے باب میں نہیں ہوسکتی۔ امام بخاری کے اِسی معیار کی وجہ سے اُن کی کتاب 'صحیح البخاری' میں حدیثوں کی تکرار ہوتی رہتی ہے اور تیسری وجہ ہے اپنی معلومات پر بہت زیادہ اعتماد کر لینا۔

ایک اور وجہ جو ناقص مطالعہ کی بنیاد ہے، وہ یہ ہے کہ اکثر اہلِ علم یہ گمان کرتے ہیں کہ دورِ جدید میں ہم نے جو باتیں پیش کی ہیں اور جس طرح کی نئی نئی دریافت اکٹھا کی ہیں، قدیم زمانے کے علماء اُس سے غافل رہے ہیں۔ یہ سوچ کر جب بھی کوئی نئی دریافت اور نیا مطالعہ سامنے آتا ہے تو بس لوگ آنکھ بند کر کے اُسے اپنا مطالعہ اور اپنی دریافت سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ بہت بار ایسا ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے میں پیدا ہونے والے مسائل کا ذکر قدیم علماء کی کتابوں میں پایا جاتا ہے اور ہم جسے اپنے زمانے کی فکر اور اپنے دور کی دریافت سمجھتے ہیں، اُسے بہت پہلے ہی لوگوں نے پیش کر دیا ہے۔ میرے مطالعہ میں اِس طرح کا اکثر اتفاق سامنے آیا ہے۔ لھٰذا یہ سمجھنا کہ "میں نے سب سے پہلے فلاں چیز کو دریافت کیا ہے یا فلاں بات کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی یا فلاں بات مجھ سے پہلے کوئی نہ سمجھ سکا" انتہائی رِسکی معاملہ (risky problem) ہے، بلکہ ایک غیر علمی بات ہے۔

عجز اور کبر

عبد اور معبود کے درمیان جو فرق ہے، وہ عجز اور کبر کا فرق ہے۔ عبد انتہائی عجز کے درجے میں ہوتا ہے اور معبود انتہائی کبر کے مقام پر ہوتا ہے۔ عبد کے لئے زیادہ موزوں یہ ہے کہ وہ عجز کی نفسیات کے ساتھ جیے اور عجز کے طور طریقوں کو اختیار کرے۔ عبد کے لئے سب سے زیادہ بری چیز یہ ہے کہ وہ کبر کے احساس کے ساتھ جئے۔ کبر کا لفظی ترجمہ ہے: بڑائی اور یہ بڑائی صرف معبودِ حقیقی کی شان کے لائق ہے۔ وہی بڑا ہے اور ہر چیز سے بڑا ہے۔ اُسی کے لئے کبر ہے، کیونکہ وہی متکبّر ہے۔ اگر کوئی عبد اپنے آپ کو بڑا سمجھے اور اپنی بڑائی ظاہر کرے اور متکبّر بنے تو گویا وہ اللہ کی سیٹ پر بیٹھنے کوشش کر رہا ہے۔ جو بندہ اللہ کی بڑائی کو حقیقی معنوں میں سمجھ لے گا، وہ پھر دنیا کی کسی چیز کو بڑا سمجھنے کی نادانی نہیں کرے گا اور خود وہ بھی عجز کی زمین پر بیٹھ جائے گا۔ اللہ کے رسول ﷺ اِسی لئے سب سے زیادہ عجز اختیار کرتے تھے، کیونکہ اُنھیں اپنے معبود کے کبر کی سب سے زیادہ معرفت تھی۔

جس آدمی کے اندر عجز ہوگا، وہ عجز کا رویّہ اختیار کرے گا اور عاجز بندہ بننے کے لئے ضروری بھی ہے کہ وہ عجز کا رویّہ اختیار کرے اور عاجزانہ انداز پیش کرے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت میں عجز کا یہ نمونہ صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اُس کی ایک مثال آپ کی گھریلو زندگی میں نظر آتی ہے۔

ایک آدمی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا کہ اللہ کے رسول ﷺ اپنے گھر میں کچھ کام بھی کیا کرتے تھے؟ تو حضرت عائشہ نے جواب دیا: ''**نَعَمْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم يَخْصِفُ نَعْلَهُ وَيَخِيطُ ثَوْبَهُ وَيَعْمَلُ فِي بَيْتِهِ كَمَا يَعْمَلُ أَحَدُكُمْ فِي بَيْتِهِ**''. (ہاں! اللہ کے رسول ﷺ اپنا جوتا ٹھیک کرتے اور اپنا کپڑا سیتے اور آپ اپنے گھر میں اُسی طرح کام کرتے جس طرح تم میں سے کوئی اپنے گھر میں کام کرتا ہے۔) ایک روایت میں یہ بھی ہے: ''**كَانَ بَشَراً مِنَ الْبَشَرِ يَفْلِي ثَوْبَهُ وَيَحْلُبُ شَاتَهُ وَيَخْدُمُ نَفْسَهُ**''. (آپ ایک بشر تھے، اپنا کپڑا سیتے، اپنی بکری کا دودھ دوہتے اور اپنا کام خود کرتے۔) (مسند الامام احمد: 605-364/10 (حدیث: 26083-26948) پیغمبر کی زندگی کا یہ نمونہ اپنے اندر عجز پیدا کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ ہر آدمی اپنا کام خود کرے جس کو اِس زمانے میں سیلف سروس (self service) کہا جاتا ہے۔

گناہ میں نیکی

حضرت عمر نے ملک روم کی جانب ایک لشکر روانہ کیا، جس میں عبداللہ بن حُذافہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ دشمنوں نے کئی مسلمانوں کو پکڑ کر قیدی بنالیا، اُن قیدیوں میں حضرت عبداللہ بن حذافہ بھی تھے۔ دشمن اُنھیں لے کر اپنے بادشاہ کے پاس پہنچے۔ اُنھوں نے بادشاہ کو بتایا کہ یہ محمد کے ساتھی ہیں۔ بادشاہ نے عبداللہ بن حُذافہ سے کہا کہ کیا تم نصرانیت قبول کرنا پسند کرو گے تو میں اپنا آدھی باشادہت تمھیں دے دوں گا؟

اُنھوں نے کہا: تم اپنی تمام بادشاہت دو مرتبہ مجھے دو یا سارا ملکِ عرب میرے حوالے کرو، میں پلک جھپکنے بھر بھی محمد کے دین سے نہیں پھر سکتا۔

بادشاہ نے کہا: تب تو میں تمھیں قتل کر دوں گا۔

اُنھوں نے کہا: جیسی تمھاری مرضی۔

چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا کہ اِسے سولی پر چڑھا دو اور تیر اندازوں سے کہا کہ اُس کے جسم سے بالکل قریب ہو کر تیر چلائیں۔ بادشاہ اُنھیں نصرانیت کی پیش کش کر رہا تھا اور وہ برابر انکار کر رہے تھے۔ پھر اُنھیں سولی سے نیچے اُتارا اور ایک ہانڈی منگائی اور اُس میں پانی ڈال کر نیچے آگ سلگا دی، پھر دو مسلمان قیدیوں کو بلایا تو اُس کے حکم سے ایک قیدی کو ہانڈی میں ڈال دیا گیا۔ بادشاہ اُنھیں نصرانیت کی پیش کش کر رہا تھا اور وہ برابر انکار کر رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر عبداللہ بن حُذافہ رونے لگے۔ بادشاہ کو اطلاع دی گئی کہ وہ رو رہے ہیں تو اُس نے سمجھا کہ اب وہ گھبرا کر رونے لگے ہیں۔ بادشاہ نے کہا: کہ اُسے میرے پاس لاؤ۔ بادشاہ نے پوچھا: کیا سوچ کر رو رہے ہو؟

عبداللہ بن حُذافہ نے جواب دیا: میں سوچ رہا ہوں کہ میرے پاس یہی ایک جان ہے جسے ہانڈی میں ڈالا جائے گا تو وہ چلی جائے گی۔ کاش میرے پاس میرے بالوں اِتنی جانیں ہوتیں اور اُن سب کو اللہ کے لئے آگ میں ڈالا جاتا!

یہ سن کر بادشاہ نے کہا: اگر تم میرے سر کو بوسہ دو تو میں تمھیں رِہا کردوں۔

اُنھوں نے کہا: کیا سارے قیدیوں کو رِہا کردو گے؟

بادشاہ نے کہا: ہاں! تب عبد اللہ بن حُذافہ نے بادشاہ کے سَر کو بوسہ دیا۔

جب عبد اللہ بن حُذافہ اُن قیدیوں کو لے کر حضرت عمر کے پاس آئے اور سارا واقعہ سنایا تو حضرت عمر نے کہا: ہر مسلمان پر یہ حق ہے کہ وہ عبد اللہ بن حُذافہ کے سر کو بوسہ دے، سب سے پہلے میں بوسہ دیتا ہوں۔ چنانچہ حضرت عمر نے عبد اللہ بن حُذافہ کے سر کو بوسہ دیا۔ (سیر اعلام النبلاء: 14/2)

یہ اللہ کے لئے جینے مرنے کی ایک انتہائی مثال ہے۔ حضرت عبد اللہ بن حُذافہ رضی اللہ عنہ اللہ کے نام پر جان دینے کے لئے تیار تھے۔ اُن کی غیرتِ ایمانی کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ جان کے ڈر سے اپنا دین چھوڑ دیں۔ جس انسان کے اندر ایمان کی اتنی زیادہ غیرت تھی، وہ انسان مشرک بادشاہ کی پیشانی چومنے کے لئے تیار ہوگیا؟! پیشانی محبت اور تعظیم کی وجہ سے چومی جاتی ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ ایک سچا مومن، مشرک بادشاہ کی پیشانی چومنے کے لئے تیار ہوجائے؟ عبد اللہ بن حُذافہ کا مشرک بادشاہ کے سر کو بوسہ دینا محبت اور تعظیم کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ وہ صرف ایک فارمیلیٹی (formality) تھی۔ مقصد سر کو بوسہ دینا نہیں تھا، بلکہ اللہ کے اُن بندوں کی جان بچانا تھا جن کے ساتھ ایمان کا رشتہ تھا۔ وہ ایمان کے لئے مشرک بادشاہ کی ہر پیش کش کو ٹھکرا کر اپنی جان کا خطرہ مول لینے کے لئے بھی تیار تھے اور اُسی ایمان کے لئے مشرک بادشاہ کی پیشانی چومنے کو بھی تیار ہوگئے۔ حضرت عمر نے اُن کے اِس عمل کو بہت زیادہ سراہا، بلکہ اُن کی نگاہ میں عبد اللہ بن حُذافہ کی اتنی زیادہ عزت بڑھ گئی کہ اُنھوں نے خود بھی عبد اللہ بن حُذافہ کے سر کو بوسہ دیا اور سارے مسلمانوں کو بھی یہی حکم دیا۔

اِس سے دین کا ایک اصول معلوم ہوتا ہے کہ ضروری نفع پہنچانا ہمیشہ ایک مطلوب عمل ہوتا ہے، اگرچہ اُس کے لئے کسی بڑے گناہ سے گزرنا پڑے۔ مسلمان کی عزت کی خاطر، مشرک کے آگے اپنا وقار کھودینا بھی اچھا ہوتا ہے۔ اپنے وقار کی خاطر مسلمانوں کو ذلیل کردینا یقیناً گناہ ہے، لیکن گناہ کے راستے سے مسلمان کے جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کرنا بلاشبہ جائز ہے۔

مالدار مفلس

امام احمد، امام مسلم اور امام ترمذی نے ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث روایت کی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ سے پوچھا: کیا تم لوگ جانتے ہو کہ مفلس کون ہوتا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہمارے درمیان مفلس وہ ہوتا ہے جس کے پاس نہ پیسہ ہو اور نہ ساز و سامان۔ آپ نے فرمایا: میری امت کا مفلس وہ ہے، جو قیامت کے دن روزہ، نماز اور زکوٰۃ کے ساتھ آئے گا اور اِس حال میں آئے گا کہ اُس نے دنیا میں کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر الزام لگایا ہوگا اور کسی کا مال کھایا ہوگا، تو اُس کو بٹھا دیا جائے گا، پھر بدلے کے طور پر اُس آدمی کی نیکیاں ہر ایک کو تقسیم کی جائیں گی۔ اگر اُس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی (جبکہ ابھی اُس کے گناہوں کا فیصلہ باقی ہوگا) تو باقی مظلوموں کا گناہ اُسی کے سر ڈال دیا جائے گا، پھر اُسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا''۔ (مسند الامام احمد: 427/4 (حدیث: 9077) صحیح مسلم: 1200/2 (حدیث: 2581) ترمذی: 217/4 (حدیث 2418)

اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی حیثیت دنیا کے اعتبار سے متعین نہیں ہوتی، بلکہ انسان کی حیثیت آخرت کے اعتبار سے متعین ہوتی ہے۔ دولتمند انسان، دنیا میں ہر طرح کی آسائش میں جیتا ہے، لیکن اگر اُس نے آخرت کی آسائش کا انتظام نہیں کیا تو وہ دنیا میں آسائشوں والا اور آرام اُٹھانے والا نہیں۔ اُس کو اگر ''مالدار مفلس'' کہا جائے تو درست ہے۔ اِس کے برخلاف اگر کوئی انسان دنیا میں کنگال ہو گیا، لیکن اُس نے نیک اعمال کے ذریعے آخرت کا سرمایہ اکٹھا کر لیا تو وہ دنیا میں ''کنگال دولتمند'' ہے۔ بہت زیادہ نماز روزہ کرنا کسی ظالم انسان کو نجات دلانے والا نہیں۔ ظلم ہر عمل کو بے کار کر دیتا ہے۔ دنیا کا قانون ظالم کو صرف اُس کے ظلم کی سزا دیتا ہے۔ یہ نہیں کرتا کہ ظالم کا روپیہ پیسہ مظلوم کے حوالے کر دے، لیکن اِس سے مظلوم کو کیا فائدہ؟ یہ ایک ناقص سزا ہے۔ ظالم کو آخرت میں اُس کے ظلم کی کامل سزا ملے گی۔ اُس کی نیکیاں مظلوموں کو دے دی جائیں گی اور مظلوموں کا گناہ اُس کے سر ڈال دیا جائے گا۔ نیکیوں کا خزانہ رکھنے کے باوجود ظلم کی وجہ سے اُسے کنگال کر دیا جائے گا۔ آخرت میں ظالم کو زبردست نقصان پہنچے گا اور مظلوم کو بھرپور فائدہ ملے گا۔

دعوت: نقصان اور فائدہ

عرف میں تبلیغ کا مطلب ہے: مسلمانوں کو دین کی طرف بلانا اور اُنھیں دین سکھانا۔ اور دعوت کا مطلب ہے: غیر مسلموں کو دین کی طرف بلانا اور اُنھیں اسلام کے بارے میں بتانا۔

تبلیغ کا کام تو بڑے پیمانے پر پوری دنیا میں ہو رہا ہے، لیکن دعوت کا کام صفر کے درجہ میں ہے۔ مسلمانوں کا اِس ذمہ داری سے غافل ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے غیر مسلموں کو کلّی طور پر اپنا دشمن سمجھ لیا ہے۔ دشمن سمجھ لینے کی وجہ سے اُن کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ ختم ہو گیا اور وہ قابلِ نفرت بن کر رہ گئے۔ جب دشمن اِس حد تک پہنچ جاتا ہے تو اُس کے لئے دل میں خیر خواہی کا جذبہ نہیں رہ جاتا اور ''دعوت'' کے لئے خیر خواہی کا جذبہ ہونا پہلی شرط ہے۔ نفرت کرنے سے ایک نقصان یہ ہوا کہ پوری دنیا میں ''دعوت'' کا کام ایک اجنبی کام بن کر رہ گیا ہے۔ دوسرا نقصان یہ ہوا کہ مسلمان، غیر مسلموں کا ایک مخالف گروہ بن کر رہ گیا اور مسلمانوں کا چھوٹا چھوٹا بہت سا گروپ اُن کے خلاف ہتھیار لے کر کھڑا ہو گیا۔ اِس سے دشمن کو موقع ملا اور اُس نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دے کر اُن کے خلاف ظلم اور تشدد کی کاروائی کرنے لگا۔ اگر دنیا بھر میں مسلمان دعوت کا کام کرتے رہتے تو اُس کا ایک فائدہ یہ ہوتا کہ بہت سے غیر مسلموں تک اسلام پہنچتا اور وہ اسلام کے بارے سنجیدہ ہو جاتے اور مسلمانوں کو اپنا مخالف گروہ نہ سمجھتے اور بہت حد تک ممکن تھا کہ اُن میں سے کچھ لوگ اسلام قبول کر لیتے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوتا کہ ایسے ماحول میں جبکہ دعوت کا کام جاری ہوتا، اگر مسلمانوں کا کوئی گروہ ہتھیار لے کر اٹھتا تو غیر مسلم صرف اُسی گروہ کے مخالف ہوتے اور عام مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینے کے بجائے صرف اُسی گروہ کو دہشت گرد سمجھتے اور اُسی کے خلاف کاروائیاں کرتے۔ جیسے ہندوستان میں اُس کی مثال ''ماؤوادی'' ہیں۔ یہ غیر مسلموں کی دہشت گرد تنظیم ہے، لیکن ایک بھی غیر مسلم اُس کی حمایت اور ہمدردی نہیں کرتا اور کوئی بھی غیر مسلم اُس تنظیم کا آپریشن کرنے والی ہندوستانی حکومت کی مذمت نہیں کرتا، جس سے غیر مسلموں کو یہ فائدہ پہنچا کہ ماؤوادیوں کے ساتھ صرف دہشت گرد کا نام جُڑا، اُنھیں کوئی بھی ہندو دہشت گرد کے حوالے سے یاد نہیں کرتا۔

اُلٹی تشریح

ہندوستان کی ایک معروف اِسلامی تحریک ہے، جس کا مرکز دہلی میں واقع ہے۔ اُس تحریک کے ایک خاص معاون سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں آپ کے بانیِ تحریک سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں، دہلی سے دورہ کر میں اُن سے کس طرح رابطہ کروں۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ آپ ہمارے یہاں سے شائع ہونے والے لٹریچر کا مطالعہ کریں۔ میں نے کہا کہ میں بہت کچھ پڑھ چکا ہوں، اُنھوں نے کہا کہ بار بار پڑھئے۔ میں نے کہا کہ میں بار بار پڑھ چکا ہوں۔ تب اُنھوں نے کہا کہ ہمارے بانیِ تحریک کا لٹریچر فکری ہوتا ہے جسے سرسری انداز میں پڑھنے سے کام نہیں چلے گا، اُسے بار بار پڑھنے کی ضرورت ہے، پھر سوال کیجئے۔ اُنھوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ''اِسی لئے سوال کو نصف علم کہا گیا ہے''۔ یعنی پہلے پڑھ لے، پھر سوال کرے۔

یہ اُلٹی تشریح کی ایک واضح مثال ہے۔ ایک ضعیف حدیث ہے: ''حُسْنُ السُّؤَالِ نِصْفُ الْعِلْمِ''۔ یعنی اچھا سوال نصف علم ہے۔ (شعب الایمان: 503/8 (حدیث: 6148) اِس حدیث کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ ذہن میں سوال اُسی وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ ایک حد تک معلومات ہو چکی ہو، لھٰذا جب بھی کوئی آدمی معیاری سوال کرے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اُس نے اپنے موضوع پر ایک حد تک غور کر لیا ہے، اَب اُسے مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے کسی رہنمائی کی ضرورت اور طلب ہے، اُسی ضرورت اور طلب کا دوسرا نام سوال ہے۔ ایسی ہی حالت میں آدمی سوال کر بیٹھتا ہے۔ جیسے حدیث میں آیا ہے: ''وَالطُّهُوْرُ نِصْفُ الْإِيْمَانِ وَالصَّوْمُ نِصْفُ الصَّبْرِ''۔ (مسند الامام احمد: 464/7 (18781) ترمذی :493/5 (3519) یعنی روزہ نصف صبر ہے اور وضو نصف ایمان ہے۔) روزہ اِس بات کی علامت ہے کہ روزہ دار کے پاس نصف صبر ہے اور وضو اِس بات کی علامت ہے کہ باوضو آدمی کے پاس نصف ایمان ہے۔ یہ نہیں کہ روزہ سے پہلے کچھ اور کرے تب روزہ رکھے تو نصف صبر ہوگا یا وضو سے پہلے کچھ اور کرے تب وضو کرے تو نصف ایمان ہوگا۔ یہ ایک غلط اور اُلٹی تشریح ہوگی۔ اُسی طرح سوال کرنا اِس بات کی علامت ہے کہ سائل کے پاس نصف علم ہے۔ اِسی لئے سوال کرنے والے سے کوئی یہ نہیں کہتا کہ پہلے جا کر پڑھو لکھو، پھر سوال کرو، بشرطیکہ وہ سوال معیاری ہو۔